بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغازِ سخن

انسانی تعلقات کا مسئلہ سماج کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت اور نزاکت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کہ سماج میں مختلف افکار و نظریات اور عقائد و مذاہب کے ماننے والے ساتھ رہتے ہوں، ان کا طرزِ حیات اور ان کی تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے الگ ہو۔ اس صورتِ حال میں ظلم و زیادتی، حق تلفی اور ناانصافی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں فکری تعصّبات، ذاتی اور قومی رجحانات اور سماجی عوامل رکاوٹ بننے لگتے ہیں۔ اس پر قابو پانا ہر مہذب اور صالح سماج کی اولین ضرورت ہے۔

انسانی تعلقات کا اخلاق اور قانون سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اخلاق کا ہدف ان تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانا ہے۔ قانون اس لیے ہے کہ انھیں جائز حدود میں رکھے اور کسی کو ان سے انحراف اور تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اخلاق اور قانون اپنا فرض ادا کریں تو سماج کو امن و امان اور سکون کی دولت نصیب ہوگی، ورنہ جنگل کا راج ہوگا، حقوق پامال ہوں گے اور طاقت ور کے ظلم اور چیرہ دستی سے کم زور سسکتے اور بلبلاتے رہیں گے۔

دنیا نے الفت و محبت کے پھول کھلتے بھی دیکھے ہیں اور قتل و خون اور فتنہ و فساد کی کشتِ خزاں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ خدا کی اس زمین پر طبقات کا تصادم بھی رہا ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق بھی پایا گیا ہے۔ ظلم و زیادتی اور استحصال کی تیز و تند

آندھیاں بھی چلی ہیں اور عدل و انصاف اور ایثار و ترجیح کے خوش گوار مناظر بھی دیکھنے میں آتے رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی روح تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ وہ انسان کو اخلاق اور قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس لیے انسانی تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانے اور عدل و انصاف کے قیام میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس کہ دنیا کے بیش تر مذاہب سے یہ روح مفقود ہوتی چلی گئی اور بے جان رسوم نے اس کی جگہ لے لی۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی کہ زمانہ کی رفتار اور تغیر پذیر حالات میں زندگی کے پیچیدہ مسائل اور ان کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ ان کے غیر عقلی اور جامد رویے نے دنیا کو ان سے بے زار اور متنفر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب سے رہ نمائی کا مقام چھن گیا اور وہ انسان کی نجی زندگی تک محدود ہوکر رہ گیا۔ وہ فرد کی محض ذاتی دلچسپی کا موضوع بن گیا اور اجتماعی امور و معاملات اس سے آزاد قرار پائے۔ یہ رویہ پہلے مغرب نے اپنایا اور اس کے زیر اثر مشرق نے بھی عملاً اسے قبول کرلیا۔

اس وقت دوسرے مذاہبِ عالم زیر بحث نہیں ہیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے بارے میں اس رویہ کو اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، لیکن مختلف اسباب و عوامل کے تحت دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے ساتھ زیادہ سخت روش اختیار کی گئی۔ اسے اس طرح پیش کیا گیا جیسے وہ آج کے مہذب سماج کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس کا فروغ نوعِ انسانی کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔ اس کی تاریخ، نوعِ انسانی پر ظلم و زیادتی کی تاریخ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام علیٰحدگی پسند ہے اور فرد کے اندر یہی رجحان پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے اور مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں سے قطع تعلق کا حکم دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ان سب افراد سے کاٹ دیتا ہے جو اس سے اختلاف

رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے۔ اسلام کی واضح تعلیمات اس کی تردید کرتی ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط سے کبھی منع نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ مسلمان کسی دوسرے گروہ میں ضم ہوجائیں۔ اس کے لیے اس نے کچھ حدود مقرر کر رکھے ہیں۔ ان حدود کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بااصول اور نظریاتی ملت کے لیے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کی تردید آسان نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کے بارے میں یہ تصور ہے کہ اس میں سارے حقوق مسلمانوں کو حاصل ہوں گے اور غیر مسلم بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہوں گے۔ حالاں کہ اسلامی ریاست کا مقصد قرآن کے الفاظ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر (الحج:۴۱) اور عدل و انصاف کا قیام ہے۔ (الحدید:۲۵) وہ ہر انسان کے جائز اور فطری حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

ان خیالات کے پیچھے ناواقفیت اور لاعلمی کے ساتھ بہت سے تاریخی عوامل کارفرما ہیں۔ ان میں اسلام کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کی نفسیات، اسلام کی سربلندی اور فرماں روائی کا خوف اور اسے کسی قیمت پر گوارا نہ کرنے کا جذبہ اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور عداوت جیسے محرکات شامل ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کی صاف اور واضح تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش تو نہیں ہوتی، البتہ انھیں مسخ کرنے اور اسلام کو بھیانک شکل میں پیش کرنے کی تدبیریں ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پورے رویہ میں مسلمانوں کی کوتاہی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے موجودہ دور میں مختلف مسائل کے سلسلے میں غیر مسلموں کے سامنے سنجیدہ اور علمی انداز میں اسلام کا موقف واضح کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی جیسے ہونی چاہیے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کی کمی بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ دونوں میں طویل عرصہ سے ایک طرح کی دوری اور حجاب پایا جاتا ہے۔ ایک

دوسرے کے موقف کو سمجھنے کے لیے جس ٹھنڈے ماحول کی ضرورت ہے اس کی کمی بلکہ فقدان رہا ہے، اس لیے بدگمانیاں پیدا ہوتی اور نشو ونما پاتی رہی ہیں۔

اس نازک اور اہم مسئلے میں اسلام کے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

۱- یہاں اس سے بحث نہیں کہ دنیا کے مذاہب میں کس کا رول شخصی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور کس کے دائرے میں اجتماعی مسائل بھی آتے ہیں۔ البتہ اسلام کی حد تک یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ ایک جامع اور مکمل دین اور عقیدہ وعمل کا ایک مربوط نظام ہے۔ اس نے اس وسیع کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق صرف مضبوط عقیدہ ہی نہیں دیا، بلکہ اس کی بنیاد پر انسان کی زندگی کو ایک خاص رخ عطا کیا ہے۔ وہ عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق جوڑتا اور اسے استحکام بخشتا ہے اور اخلاق اور قانون میں اس کے احکام کا اسے پابند بناتا ہے۔ خاندان، معاشرہ، ریاست، شخصی، ملی اور بین الاقوامی تعلقات سب اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ اس کے اس موقف سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطالبہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ انفرادی زندگی تک اپنے آپ کو سمیٹ لے۔ وہ محدود مذہبیت کا مخالف ہے، جس میں خدا اور قیصر کے حقوق الگ ہوں۔

۲- اسلام ایک عالمی دین ہے۔ وہ خدا کا آخری پیغام ہے، جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا خطاب سب انسانوں سے اور ان کے سبھی طبقات سے ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:۱۵۸)

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ اللہ جس کا آسمانوں اور زمین پر اقتدار ہے۔

جس دین کا خطاب دنیا کے تمام انسانوں اور ان کے تمام طبقات سے ہو، جو

اس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ سارے عالم کی فلاح ونجات کا ذریعہ ہے، وہ کسی طبقہ سے نفرت اور عداوت کا سبق نہیں دے سکتا، ورنہ اس کا خطاب محدود ہوکر رہ جائے گا۔ وہ نظریات جو مختلف طبقات کے درمیان کشمکش پیدا کرتے اور ایک کے ذریعے دوسرے کا استحصال کرتے ہیں، ان میں عمومی اپیل نہیں ہوتی، وہ ایک کے لیے پرکشش ہوتے ہیں تو دوسرے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

۳- اسلام نے اپنے عقیدے اور فکر کو عام کرنے کے لیے جبر و اکراہ کے تمام طریقوں کو رد کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ اس کے نزدیک ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کے لیے اس نے صرف دعوت وتبلیغ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ وہ اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے قبول یا رد کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس نے صبر و ثبات کے ساتھ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور مخالفت اور مزاحمت کو عزم و حوصلہ اور ہمت سے برداشت کرنے کا حکم دیا ہے:

وَ اصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا○ (المزمل:۱۰) — جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور ان کو اچھی طرح چھوڑ دو۔

اس نے بار بار کہا کہ یہ راہ عفو و درگزر کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا دامن چھوٹنے نہ پائے:

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ○ (الزخرف:۸۹) — ان سے درگزر کیجیے اور سلام کہیے ان کو بہت جلد (اپنا انجام) معلوم ہوجائے گا۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ○ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ○ (الحجر:۸۵،۸۶) — ان سے اچھی طرح درگزر کیجیے۔ تمھارا رب وہی ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور باخبر بھی ہے۔

اس نے اپنے ماننے والوں کی یہ خوبی بیان کی ہے:

وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران:۱۳۴) — وہ غصہ کے پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔

اس نے ہدایت کی ہے کہ بات چیت میں، دعوت میں اور اپنے طرزِ عمل میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے بدترین دشمن کی بھی دشمنی ختم ہوجائے اور وہ دوستوں کی صف میں آجائے۔ (حم السجدۃ:۳۴،۳۵)

کیا ان واضح تعلیمات کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنے مخالفوں کو برداشت نہیں کرتا اور ان سے جنگ کی زبان میں بات کرتا اور اپنا عقیدہ ان پر بہ جبر مسلط کرتا ہے؟

۴- اسلام سچے دل سے خدا اور رسول کو ماننے اور خوش دلی سے ان کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ چیز جبر و اکراہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ جہاں جبر و اکراہ ہوگا وہاں ایمان اور اسلام کا اظہار تو ہوجائے گا، لیکن حقیقت میں یہ ایمان نہیں بلکہ نفاق ہوگا۔ قرآن مجید نے نفاق کو دل کا روگ، کذب و افترا اور خدا اور رسول کے ساتھ دھوکہ اور فریب کہا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُم بِمُؤْمِنِيْنَ○ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُم وَ مَا يَشْعُرُوْنَ○ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً وَّلَهُم عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ○ (البقرۃ:۸-۱۰)

لوگوں میں بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے حالاں کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اسے محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے۔ اللہ نے ان کے اس روگ میں اضافہ کر دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بول رہے ہیں۔

اس نے کہا کہ منافقین کا وہی انجام ہوگا جو خدا کے منکرین کا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا○ (النساء:۱۴۰)

بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں یک جا جمع کردے گا۔

ایک اور جگہ ان کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ○ بے شک منافقین جہنم کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔ (النساء:۱۴۵)

قرآن مجید نے منافقین پر جتنی سخت تنقید کی ہے اور ان کی ذہنی پستی، خودغرضی، بے عملی، بلکہ بدعملی کو نماں کیا ہے اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے، کیا اس کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی صفوں میں منافقین کا اضافہ ہوتا چلا جائے؟ کیا وہ ایسا طریقہ اختیار کرے گا کہ سماج میں نفاق کی آبیاری ہو اور وہ فروغ پاتا چلا جائے؟ اسلام اگر جبر و اکراہ کے موقف میں ہوتو بھی کسی کو ایمان اور اسلام پر مجبور نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اس سے نفاق کی راہ کھلتی ہے۔ دنیا کا کوئی عقیدہ اور کوئی فکر نفاق کو برداشت نہیں کرتا، کیا اسلام ہی اس کے ابھرنے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرے گا؟

اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ یہ سوال ابھر آتا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کی کیا حیثیت ہوگی؟ ان کے حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا؟ اس ذیل میں بھی بعض باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱- اسلامی ریاست انسان کی حکم رانی کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حکم رانی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں اقتدار کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، کوئی فرد یا گروہ یا مجموعۂ افراد نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ریاست اپنا نظم چلاتی ہے۔ اس میں حالات وظروف کے لحاظ سے نئے قوانین بھی وضع ہوں گے اور نئی راہیں بھی تلاش کی جائیں گی، لیکن یہ سب کچھ کتاب وسنت کے حدود کے اندر ہوگا۔ اس سے باہر نکلنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔

۲- اسلامی ریاست کی باگ ڈور فطری طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو

قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے مملکت کی اساس تسلیم کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اس پر ایمان نہیں ہے ان پر نہ تو اس کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے اور نہ وہ اسے خوش دلی سے چلا سکتے ہیں۔ لیکن ریاست میں انھیں خدا اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہوگی۔ اسلامی قانون کی رو سے ان کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی فرد یا جماعت کو ان حقوق پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔ انتظامی امور میں حکومت ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

۳- اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور ان سے تعلقات کا یہ قانونی پہلو ہے۔ لیکن عام زندگی میں قانون سے زیادہ اخلاقی رویہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلام نے تعلقات میں صداقت اور راست بازی کی پابندی اور جھوٹ اور مکر و فریب سے اجتناب کا حکم دیا ہے، نخوت و استکبار کی جگہ تواضع اور خاک ساری کا مزاج پیدا کیا ہے، درشت مزاجی اور شدت کے مقابلے میں نرمی اور رافت کو پسند کیا ہے، غیظ و غضب پر قابو پانے اور تحمل و برداشت کا رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انتقام میں حد سے آگے نہ بڑھنے اور عفو و درگزر سے کام لینے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی ترغیب دی ہے، شر اور فتنہ وفساد سے بچنے اور ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی ہے۔ یہ ہدایات بالکل عام ہیں۔ ان کا تعلق خاص مسلمانوں سے نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے تعلقات میں ان کا احترام کریں۔ اس معاملہ میں اسلام نے اپنوں اور غیروں میں فرق نہیں کیا ہے۔ ایک مسلمان کا ربط و تعلق کسی بھی مذہب و عقیدہ کے ماننے والے سے ہو، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کا پابند رہے گا۔ جس سماج میں ان اخلاقیات کی فرماں روائی ہو وہاں فطری طور پر ظلم و زیادتی کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے اور اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی غلط قدم اٹھے تو قانون اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگا اور اپنا فرض انجام دے گا۔

۴- اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ جہاد کا ذکر اس طرح چھڑ جاتا ہے

جیسے اس کا مقصد وجود یا اولین ہدف مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف صف آرا کرنا اور جہاد کے نام پر قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کرنا ہے۔ حالاں کہ جس طرح دنیا کی ہر ریاست کو جنگ سے سابقہ پیش آسکتا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کو بھی جہاد کرنا پڑسکتا ہے۔ اسے اس کے حقیقی پس منظر میں اور اسلام کی زیادہ وسیع اور عمومی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ وہ ایسی جنگ نہیں ہے جو قتل وخوں ریزی اور انسانوں کو محکوم بنانے اور حکم رانی کی خواہش کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے، بلکہ اس جنگ کے پیچھے اعلیٰ اخلاق، عدل و انصاف پر مبنی قانون، دعوت وتبلیغ کا مخلصانہ جذبہ اور انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کی تمنا اور آرزو موج زن ہوتی ہے۔ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے کتنی مختلف ہوگی اور اس کے کتنے اچھے ثمرات سامنے آئیں گے؟

آئندہ صفحات میں غیر مسلموں سے تعلقات کی بحث بھی ہے اور ان کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ تعلقات میں خاندانی، سماجی، معاشرتی، معاشی کئی طرح کے تعلقات زیر بحث آئے ہیں۔ بعض اختلافی مسائل میں شریعت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ان تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ تعلقات اور حقوق فرد اور ریاست دونوں ہی سے متعلق ہیں، البتہ تعلقات میں شخصی پہلو غالب ہے، حقوق کا رشتہ ریاست سے جڑ جاتا ہے۔ ریاست کی بحث میں غیر مسلم کی حیثیت اور اس کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ اس ذیل میں جہاد اور اس کے احکام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری صفحات میں غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام و ہدایات کا پس منظر بیان ہوا ہے۔

کتاب میں اصلاً قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کی شرح وتفسیر میں معتمد علماء اور شارحین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض فقہی مسائل میں فقہاء کے خیالات تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں صرف وہ رائے بیان کی جانی چاہیے جسے لکھنے والا صحیح سمجھتا ہو اور جسے اس کے نزدیک

ترجیح حاصل ہو، اس لیے کہ تفصیلات سے ذہن الجھن محسوس کرتا ہے۔

یہ ممکن تھا اور آسان بھی۔ لیکن جن حضرات کی فقہی ذخیرہ پر نظر ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے سامنے دوسری رائیں بھی ہوتیں۔ وہ یہ سوچ سکتے تھے کہ اس بحث میں ذاتی رجحان کے تحت مخالف رایوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ مختلف رایوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی کسی رائے کو ترجیح دی جائے۔ پھر یہ کہ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے۔ دنیا کے ہر موضوع کا، جس میں فقہ بھی شامل ہے، تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید علمی تصنیفات اور انسائیکلو پیڈیاز میں یہی طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ بعض فقہاء کے خیالات سے غیر مسلم قارئین توحش محسوس کریں گے، اس لیے ان کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی بہت زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطالعۂ مذاہب اب عام ہو رہا ہے۔ ہمارے دینی اور فقہی لٹریچر سے مسلمان علماء ہی نہیں، غیر مسلم اصحابِ علم بھی واقف ہیں۔ وہ فقہی اختلافات کے درمیان صحیح نقطۂ نظر جاننا چاہیں گے۔ اس لیے ان کے لحاظ سے بھی مناسب اور معقول طریقہ یہی ہے کہ زیر بحث مسائل میں فقہی آراء کا تجزیہ کر کے بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں بہتر اور موزوں رائے کیا ہے؟ اور اسے کس بنیاد پر ترجیح حاصل ہے؟ یہاں اسی کی کوشش رہی ہے، لیکن اس کوشش میں کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی گئی ہے جو بے دلیل ہو اور جسے سلف کی بالکل تائید حاصل نہ ہو۔

فقہاء کی رایوں میں سختی بھی ہے اور نرمی بھی، تنگی بھی ہے اور توسع اور کشادگی بھی۔ جن مسائل میں فقہاء کی رائیں سخت اور بے لچک معلوم ہوتی ہیں جیسے غیر مسلموں سے ملکی خدمات لینے یا مختلف معاملات میں ان پر اعتماد کا مسئلہ، انھیں اُس وقت کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، ورنہ انھیں ہدفِ تنقید بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کے دورِ اول یا اس کی ابتدائی صدیوں میں جو ممالک فتح ہوئے یا جہاں

تبلیغ و دعوت کامیاب رہی وہاں کی اکثریت دین کے آغوش میں آتی چلی گئی۔ اس میں حجاز، مصر، عراق، شام اور افریقہ و ایشیا کے بعض ممالک شامل ہیں۔ یہاں غیر مسلم تھے بھی تو چھوٹی سی اقلیت میں تھے۔ ان ممالک میں اور اس وقت کے حالات کے تحت حکومتی اداروں میں غیر مسلموں کی شرکت نمایاں نہیں ہے اور فقہاء کے ہاں اس طرح کی رائیں بھی ملتی ہیں کہ ملکی نظام، اس کے دفاع اور حفاظت کے لیے ان کی خدمات کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی مملکت ہے جس میں مسلمان اپنے تمام داخلی و خارجی امور میں خود کفیل ہیں اور انھیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہے۔ یہ صورت حال ان ممالک کی نہیں ہوسکتی جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اقلیت میں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں۔ یہاں امورِ مملکت سے انھیں علیحدہ نہیں رکھا جاسکتا، انھیں شریک کیے بغیر اس کا چلانا ممکن نہ ہوگا۔ اس صورت میں بظاہر فقہی رائے بھی مختلف ہوگی۔

موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج وجود میں آرہے ہیں اور کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ اقلیتیں انتظامِ ملکی میں شریک رہیں، انھیں الگ تھلگ نہ رکھا جائے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

معاملات میں غیر مسلموں پر اعتماد اور عدم اعتماد کی بحث میں خیال ہوتا ہے کہ اس وقت کی پوری دنیا کی صورت حال کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں مسلمان فی الجملہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے برتر تھے، ان کے اندر خدا کا خوف تھا، اخلاقی بلندی تھی، وہ معاملات کے صاف اور کھرے تھے، ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے اردگرد کی دنیا میں اخلاقی گراوٹ اور پستی تھی، افراد اور اقوام اپنا اعتماد کھو چکی تھیں، راست بازی، دیانت و امانت اور ایفائے عہد جیسی خوبیاں کم زور ہوچکی تھیں۔ ان حالات میں یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے معاملات میں دوسروں پر کس حد تک اعتماد کرسکتے ہیں؟ بعض حضرات نے

اسے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھا کہ افراد صحیح اور غلط ہر طرح کے ہوتے ہیں، ان کے متعلق کوئی عمومی فیصلہ درست نہ ہوگا۔ بعض حضرات نے اسے بہ حیثیت قوم دیکھا اور عمومی رائے قائم کی۔

اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی کی کیفیت ختم ہوچکی ہے، ان کا اخلاقی امتیاز باقی نہیں رہا، بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کا معیار دوسروں سے فروتر ہے۔ معاملات میں دوسرے ان سے زیادہ بھروسہ کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر مسلمانوں سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال بعض قدیم رایوں پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے۔

غیر مسلموں اور ان کے حقوق کے ذیل میں دار الاسلام، دار الحرب اور دار الامان جیسی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوئی ہیں، بلکہ فقہائے کرام نے اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف ممالک کی حیثیت واضح کرنے کے لیے وضع کی ہیں۔ ان کے نزدیک دار الاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان امن و امان کی زندگی گزار رہے ہوں اور مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہ لاحق ہو۔ دار الحرب وہ ہے جہاں کفر و شرک کا غلبہ ہو اور احکام کفر و شرک جاری ہوں۔ دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان امن کا معاہدہ ہو تو وہ دار الامن ہوگا۔ ان سب کے احکام مختلف ہیں، اس وقت دنیا کا کوئی ملک دار الاسلام ہونے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے، اسی طرح اس نے کسی ملک کو دار الحرب قرار دے کر اس سے اعلانِ جنگ نہیں کر رکھا ہے۔ دنیا کے بیش تر ممالک بین الاقوامی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ حالات اس موضوع پر از سرِ نو غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مسلم ممالک کی از روئے شرع ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کریں، ان کے حدود میں انھیں اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل کی

آزادی ہو، انھیں ترقی کے مواقع فراہم ہوں اور ان پر کسی بھی قسم کے ظلم اور زیادتی کا قانوناً سدِّ باب ہو۔

مسلمان جہاں اقلیت میں ہیں وہ دو طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ غیر جمہوری ممالک میں وہ بنیادی حقوق تک سے محروم ہیں۔ انھیں اپنے دین و ایمان کو بچانا دشوار ہو رہا ہے۔ وہ اپنے وجود و بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جمہوری ممالک میں بڑی حد تک بنیادی حقوق انھیں حاصل ہیں، انھیں جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ملا ہوا ہے، عقیدہ اور عبادت کی آزادی میسر ہے، وہ آزادی سے نماز اور روزے پر عمل کر سکتے ہیں، زکوٰۃ کا اپنا نظم چلا سکتے ہیں، حج کی انھیں اجازت ہے، مساجد کی تعمیر اور ان کی آبادکاری کا نظم کر سکتے ہیں، جمعہ اور عیدین کے قیام کی انھیں اجازت ہے، عائلی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، وقف اور ہبہ جیسے معاملات میں اسلامی قانون ان پر نافذ ہوتا ہے، وہ دینی اور دنیوی تعلیم کا نظم کرنے اور دینی مدارس اور دنیوی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں ازروئے دستور انھیں مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی بات یہ کہ جمہوری ممالک میں انھیں اپنے دین کی تبلیغ کی اجازت حاصل ہے۔ وہ اسے عام کر سکتے ہیں۔ جس ملک کے یہ حالات ہوں اسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ دین پر عمل کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے جو مواقع انھیں فراہم ہیں ان سے انھیں فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ظاہر ہے، یہ صورتِ حال دار الحرب یا دارالاسلام کی نہیں ہے۔ کسی جمہوری ملک کو نہ تو دار الاسلام کہا جا سکتا ہے اور نہ اس پر دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ دار الاسلام کی طرح یہاں غیر مسلموں کے حقوق کا سوال نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ ازروئے دستور انھیں بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ یہاں ان سے تعلقات کی نوعیت بھی وہ نہیں ہوگی جو حربیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جمہوری ملک کو ایک آزاد دعوتی ملک کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا۔ مسلمان کی حیثیت یہاں ازروئے دستور دوسرے شہریوں کی طرح ایک پرامن آزاد شہری کی ہے۔ اسی حیثیت سے غیر مسلموں

سے اس کے تعلقات استوار ہوں گے اور غیر مسلم اس سے تعلقات قائم کریں گے۔

میں برادر عزیز ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پوری کتاب کی توجہ سے پروف ریڈنگ کی، مضامین اور مآخذ کی فہرست تیار کی اور کتاب میں جن مسلم شخصیات کا ذکر آیا ہے ان کا اشاریہ مرتب کیا۔ یہ اشاریہ امید ہے اس کتاب کے لیے بھی اور اس نوعیت کی دوسری علمی کتابوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ میں نے ان تمام چیزوں پر ایک نظر ڈال لی ہے، اس کے باوجود غلطی اور فروگزاشت کا امکان ہے۔ اس کی نشان دہی علمی خدمت ہوگی اور ان شاء اللہ آئندہ اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اوراق اس کے دین کو سمجھنے کا ذریعہ ثابت ہوں، اس کے بندوں کو ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے، اپنے فضل و کرم سے وہ انھیں شرفِ قبولیت سے نوازے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ انّہٗ سمیع قریب مجیب۔

جلال الدین

۲/ اگست ۱۹۹۸ء

غیر مسلموں سے تعلقات
اور ان کے احکام

غیر مسلموں سے تعلقات

اسلام کی تصویر جن مختلف پہلوؤں سے بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے ان میں غیر مسلموں سے تعلقات کا پہلو بہت ہی نمایاں اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام انفرادیت پسند ہے، وہ مسلمانوں میں علیٰحدگی کے جذبات ابھارتا ہے، وہ انھیں دوسروں سے کاٹتا اور الگ تھلگ کرتا ہے، وہ اپنوں اور غیروں کے درمیان اتنا زبردست فرق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کے ساتھ عام انسانی تعلقات کا بھی روادار نہیں ہوتا، وہ اخلاق کا درس ضرور دیتا ہے، لیکن اس کا تعلق اپنے ماننے والوں سے ہے، دوسروں سے نہیں ہے، جو لوگ اسلام کے دائرہ میں آجائیں انھیں وہ باہم اخلاقی رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس دائرہ سے باہر اس کی تعلیمات کا رخ بدل جاتا ہے اور وہ ایک دوسری ہی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ شکل بڑی بھیانک ہے۔ اس میں محبت کی جگہ نفرت و عداوت اور نرمی کی جگہ سختی اور درشتی نمایاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کا جو مزاج بناتا اور جس طرح کی ذہنی تربیت کرتا ہے اس سے ان کی اپنے مخالفین سے ازخود مخاصمت شروع ہوجاتی ہے اور وہ ہر محاذ پر ان سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

اسلام کی اس خود ساختہ تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جن ذہنوں کی پیداوار ہے وہ یا تو ناواقفیت کا شکار ہیں یا دوسروں کو فریب اور دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام، مسلمانوں کو باہم اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، انھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے، ان کے باہم اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے، ان کے درمیان تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے[1] اور انھیں ایک نظامِ حیات دے کر ایک امت بناتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے اس امت کو ایک اعلیٰ نصب العین دیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کے دین کی علم بردار بن کر اٹھے، انسانوں کو ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دے، دنیا میں خیر کو عام کرے، بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔ اس دین کے بارے میں یہ تصور کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا کرتا ہے، انھیں ایک دوسرے کا حریف اور دشمن بناتا ہے اور ان کے تعلقات میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

آئندہ صفحات میں غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں اسلامی تعلیمات کسی قدر تفصیل سے پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجنبیت کی دیوار نہیں کھڑی کی ہے، بلکہ ان تعلقات کو وہ ایک سماجی، معاشرتی اور معاشی ضرورت سمجھتا ہے۔ اگر غیر مسلم سے خونی رشتہ اور خاندانی تعلق ہو تو اسے وہ خاص اہمیت دیتا ہے۔ یہ تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ اسلام پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اور اس کے احکام کی پوری طرح پابندی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے افراد سے انتہائی شریفانہ روابط رکھے جاسکتے ہیں اور رکھے جانے چاہئیں۔ یہ دین داری کے منافی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت کے مطابق ہے۔

---

[1] اس کی کسی قدر تفصیل راقم کے مضمون 'اہلِ ایمان کے باہمی تعلقات' میں موجود ہے۔ مطبوعہ ماہنامہ 'زندگی نو' نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۸۹ء

خاندانی تعلقات

(حسنِ سلوک کی خصوصی ہدایات)

اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے

اسلام نے اللہ تعالیٰ کا جو تصور دیا ہے اس میں اس کا رحمٰن و رحیم ہونا نمایاں ہے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کے آغاز ہی میں سورۂ فاتحہ سے ملتا ہے۔ اس کا ابرِ رحمت پوری کائنات پر ہر آن برس رہا ہے۔ اسی سے اس کا وجود قائم ہے، ہر گوشۂ عالم میں اس کی رحمت کے آثار ہویدا ہیں۔ انسان اپنی پوری زندگی میں اور زندگی کے ہر لمحہ میں اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

انسان سے رحم اور ہمدردی مطلوب ہے

اسلام چاہتا ہے کہ انسان بھی رحمت کا پیکر ہو، اس کے اندر محبت، الفت، تعاون، ہمدردی اور غم خواری کے جذبات موجزن ہوں۔ اس کی سیرت و کردار سے رحم دلی کا مظاہرہ ہو، اس کا سینہ سنگ دلی اور شقاوت سے پاک ہو، وہ اپنے ابناءِ نوع کے ساتھ وہ سلوک کرے، جس کی توقع وہ خدا کی ذات سے کرتا ہے اور جس سے وہ اپنی تمام کم زوریوں کے باوجود شب و روز بہرہ ور ہوتا رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہے، ظلم و عدوان سے اس کا دامن داغ دار نہ ہو، اس کے اندر عفو و درگزر کی صفت پائی جائے، وہ جذبات سے مشتعل نہ ہو، طیش میں نہ آئے اور غصہ پر قابو رکھے، صبر و ثبات کا دامن نہ چھوڑے اور معاشرہ میں محبت اور رحمت کی خوشبو پھیلاتا رہے:

وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد:۱۷) جو ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے ہیں اور رحم کھانے کی تاکید کرتے ہیں۔

صلۂ رحمی کی اہمیت اور اس کی ہدایت

انسانی تعلقات کے استحکام کا پہلا قدم صلہ رحمی ہے۔ اس کا تعلق خونی رشتوں سے ہے۔ اسلام نے ان رشتوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فطری طور پر جو رشتے اور ناطے ہیں ان کا احترام ہو، ان سے بہتر اور خوش گوار تعلقات ہوں، ان کے حقوق پہچانے جائیں اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی سے احتراز کیا جائے۔ اگر انسان کا اپنے قریب ترین دائرہ میں بہتر سلوک ہو تو توقع ہے کہ وسیع تر دائرہ میں بھی اس کا رویہ محبت و اخوت اور ہمدردی کا ہوگا اور پورے معاشرہ پر اُس کے خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے، لیکن اگر قرابت دار بھی انسان کے ظلم و جور کا شکار ہونے لگیں تو جن افراد سے اس کا دور کا واسطہ ہے وہ اس کی زیادتیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ صلۂ رحمی کے بغیر محبت، شرافت اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے نزدیک انسان کے قرابت دار اس کے حسن سلوک، تعاون اور ہمدردی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ کے نیک بندے ان کے حقوق سے غافل نہیں ہوتے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ○ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ○ (الرعد:۲۰،۲۱) جو اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے عہد کو نہیں توڑتے اور جو ان رشتوں کو جوڑتے ہیں، جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا جنھیں خوف لاحق رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے غافل اور دنیادار انسانوں کا حال بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی ان اعلیٰ صفات سے عاری ہوتی ہے اور وہ فساد فی الارض مچاتے پھرتے ہیں:

وَ الَّذِیْنَ یَنقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ○

جو لوگ اللہ سے کیے گئے عہد کو مضبوط بنانے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے آخرت میں برا انجام ہے۔

(الرعد:۲۵)

اسلام نے معاشرہ کے فلاح کی بنیاد عدل و احسان، قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی، فحش و منکرات اور ظلم و عدوان سے اجتناب پر رکھی ہے۔ ان اعلیٰ اقدار کے بغیر کسی مہذب سماج کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ الْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ○

بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں کو (ان کا حق) دینے کا۔ اور وہ منع کرتا ہے فحش اور منکر سے، ظلم اور سرکشی سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

(النحل:۹۰)

غیر مسلم والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

قرابت اور رشتہ داری کی بنیاد والدین ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید کی ہے[1] اس میں گو کہ غیر مسلم بھی آتے ہیں، لیکن غیر مسلم والدین کی طرف سے کبھی جارحانہ رویہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے اور نزولِ قرآن کے وقت مسلمان نوجوان اسی رویہ سے دوچار تھے۔ اس صورتِ حال میں اندیشہ تھا کہ مسلمان اولاد پر اس کا ردعمل ہو اور وہ غیر مسلم والدین کے ساتھ کوئی

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' باب 'خدمت کے یہ مستحق ہیں'۔

نامناسب سلوک کر بیٹھیں، اس لیے ہدایت کی گئی کہ عقیدہ ہر چیز پر مقدم ہے۔ ماں باپ اگر توحید کے مقابلہ میں شرک و کفر کی دعوت دیں اور اس پر اصرار کرنے لگیں تو ان کی بات ناقابل قبول ہوگی اور وہ کسی حال میں نہیں مانی جائے گی، لیکن ان کی زیادتیوں کے باوجود ان کے دنیوی حقوق ادا کیے جائیں گے اور وہ کبھی نظر انداز نہ ہوں گے۔

ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْلِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ○ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا○

(لقمان: ۱۴، ۱۵)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کم زوری پر کم زوری اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے، اس لیے ہم نے اسے وصیت کی کہ تم میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ۔

ان آیات میں صاف طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ والدین کے ساتھ، چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، حسن سلوک کیا جائے گا۔ ان کے شرک و کفر کی وجہ سے کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ ہوگی۔ علامہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے 'وَ اِنْ جَاهَدٰكَ' الخ (اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے) کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ حسن سلوک کا یہ حکم مسلم والدین اور غیر مسلم والدین دونوں ہی کے لیے ہے۔ پھر یہ فرما کر کہ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (دنیا میں ان کے ساتھ معروف کے مطابق برتاؤ رکھو) اس حکم کو موکد اور مستحکم کر دیا ہے۔

اس کے قانونی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ باپ اگر اولاد کو قتل کر دے تو اس سے (شریعت کے عام ضابطہ کے مطابق)

قصاص نہیں لیا جائے گا، وہ اس پر تہمت لگائے تو اس پر حد نہیں جاری ہوگی، اولاد کے قرض کی عدم ادائیگی پر اسے قید نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ والدین محتاج ہوں تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اس لیے کہ یہ ساری چیزیں معروف کے ساتھ برتاؤ میں آتی ہیں اور اس کے خلاف اقدام اس کے منافی ہوگا۔''[1]

فقہ حنفی کہا گیا ہے کہ آدمی کے والدین چاہے مسلمان ہوں یا کافر، ان کا نان و نفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں معروف کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ اس کا تقاضا ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ''**لیس من المعروف ان یعیش فی نعم اللّٰہ تعالٰی و یترکھما جوعاً**'' یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے چھوڑ دے۔[2]

علامہ قرطبیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

والآیة دلیل علٰی صلة الابوین الکافرین بما امکن من المال ان کان فقیرین والانة القول والدعاء الی الاسلام برفق۔[3]

آیت دلیل ہے اس بات کی کہ کافر ماں باپ کے ساتھ مال کے ذریعہ ممکن حد تک صلۂ رحمی کی جائے گی اگر وہ محتاج ہوں اور ان کے ساتھ گفتگو میں ملاطفت برتی جائے گی اور اسلام کی طرف نرمی سے انھیں دعوت دی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کا ثبوت حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے مشہور واقعہ سے ملتا ہے۔

فرماتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوگیا) میری ماں، جو مشرک تھیں، مجھ سے ملنے آئیں۔[4] میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۳/ ۴۳۳۔ احادیث سے ان تمام نکات کی تائید ہوتی ہے۔

[2] ہدایہ، ج ۲، ص ۴۲۵، ۴۲۶۔ نیز ملاحظہ ہو 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' ص ۶۳

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۴/ ۶۵

[4] ان کا نام قتیلہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں طلاق دے دی تھی۔ فتح الباری: ۵/ ۲۳۳

سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ صلۂ رحمی کرو۔[۱]

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور تحفہ گوہ، پنیر اور مکھن لائی تھیں، لیکن حضرت اسماء نے انھیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینے اور ان کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرایا تو آپ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا تحفہ قبول کرلیں اور اپنے گھر بھی آنے دیں۔[۲]

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

فیه جواز صلة القریب المشرک[۳]

اس حدیث سے مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلۂ رحمی کا ثبوت ملتا ہے۔

علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے:

فیه ان الرحم الکافرة توصل من المال و نحوه کما توصل المسلمة و یستنبط منه وجوب نفقة الأب الکافر والأم الکافرة و ان کان الولد مسلما[۴]

اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ کافر رشتہ کے ساتھ بھی مال وغیرہ کے ذریعہ صلہ رحمی کی جائے گی جیسا کہ مسلم رشتہ کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس سے یہ استنباط بھی کیا جاتا ہے کہ کافر باپ اور کافر ماں کا نفقہ واجب ہے، چاہے اولاد مسلمان ہو۔

غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلقات

قرآن مجید نے والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے۔ احادیث میں بھی ان کے ساتھ

---

۱ بخاری، کتاب الھبۃ، باب الھدیۃ للمشرکین۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی الاقربین

۲ نیل الاوطار: ۶/۱۰۶، ۱۰۷ بحوالہ مسند احمد وغیرہ

۳ نووی: شرح مسلم، ج ۳، جزء ۷، ص ۸۹

۴ ابن حجر، فتح الباری: ۵/۲۳۴

حسن سلوک کا حکم ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم رشتہ دار دونوں ہی آتے ہیں۔ بعض قانونی احکام میں ان کے درمیان فرق ہے، لیکن حسنِ سلوک اور تعاون اور ہمدردی کے غیر مسلم رشتہ دار بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں پہلے ایک قانونی فرق کی وضاحت کی جارہی ہے۔

قرآن مجید نے وراثت کے سلسلے میں یہ قانون بیان کیا ہے کہ آدمی کے خونی رشتہ دار ہی اس کے وارث ہوسکتے ہیں، غیر رشتہ دار وارث نہیں ہوسکتے۔ ورثاء کا اس نے تعین کر دیا ہے:

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ○ (النساء:۳۳)

ہم نے ہر ایک کے لیے، جو کچھ والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں، اس کے وارث مقرر کردیے ہیں۔

اسلامی قانونِ وراثت میں دین کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔ ایک مسلمان کی وراثت کا حق اس کے مسلمان قرابت داروں ہی کو ہے۔ غیر مسلم قرابت دار اس کے وارث نہیں ہوں گے۔ اسی طرح غیر مسلم کی وراثت کا حق اس کے غیر مسلم رشتہ داروں ہی کو حاصل ہوگا۔ مسلمان رشتہ دار اس سے محروم رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث ہے:

لاَ یرث المسلم الکافر و لاَ الکافر المسلم[1] مسلمان نہ تو کافر کا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوگا۔

وراثت کے کچھ اصول ہیں اور رشتہ داروں کے درمیان ایک ترتیب ہے۔ اسی لحاظ سے وہ وراثت کے حق دار ہوں گے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ اور رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں

---

[1] بخاری، کتاب الفرائض، باب لایرث المسلم الکافر۔ مسلم، کتاب الفرائض۔ اس موضوع کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۱۲۲، ۱۲۳۔ نووی، شرح مسلم: ج ۴، جزء ۱۱، ص ۵۲، ۵۳۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۶/ ۱۹۲-۱۹۴

فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ○ (الانفال:۷۵) اللہ کے قانون میں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ بات صرف وراثت کی حد تک ہے۔ اس سے ہٹ کر جو رشتہ دار اور خویش و اقارب وارث نہیں ہیں، آدمی ان کی مدد اور تعاون کرسکتا ہے اور اسے کرنا چاہیے۔ وقتِ ضرورت ان کے حق میں وصیت بھی کی جاسکتی ہے:

وَ اُوْلُو الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُھٰجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیَآءِکُمْ مَّعْرُوْفًا کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا○ (الاحزاب:۶) اور اللہ کی کتاب میں رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں دوسرے اہل ایمان اور مہاجرین سے۔ مگر یہ کہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ کوئی بھلائی کرنی چاہو تو کرسکتے ہو۔ یہ اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا غیر وارث مسلم عزیزوں اور قرابت داروں کی طرح غیر مسلم رشتہ داروں کی بھی مدد کی جاسکتی ہے اور ان کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے؟ فقہاء سلف نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، اسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی بنیاد سورۂ احزاب کی یہی مذکورہ بالا آیت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے ایک یہودی عزیز کے لیے وصیت کی تھی[1]

حضرت عکرمہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت صفیہؓ نے اپنا ایک مکان حضرت معاویہؓ کو ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ انھوں نے ایک عزیز سے، جو یہودی تھا، کہا: اگر تم اسلام لے آؤ گے تو میرے وارث ہوجاؤ گے، لیکن اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر انھوں نے اس کے نام وصیت کردی۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق وصیت تیس ہزار کی تھی[2]

---

[1] دارمی، کتاب الوصایا، باب الوصیۃ لاہل الذمہ۔ ۲/ ۵۱۷۔ ایک اور روایت میں دو یہودی قرابت داروں کا ذکر ہے۔ ابو عبید، کتاب الاموال۔ ص ۵۴۳

[2] عبد الرزاق: المصنف: ۶/ ۳۳

امام شعبی کہتے ہیں:

تَجُوْزُ وصية المسلم للنصرانی[1] مسلمان، نصرانی کو وصیت کرسکتا ہے۔

ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے سورۂ احزاب کی آیت کے اس فقرہ اِلّآ اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰی اَوْلِیَآءِکُمْ مَّعْرُوْفًا (مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ بھلائی کرو) کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: عطاء اور بخشش مراد ہے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ بخشش جو ایک مومن اپنے کافر قرابت دار کو کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ زندگی میں وہ جو اسے دیتا ہے اور اپنے بعد اس کے لیے جو وصیت کرتا ہے۔[2]

حضرت قتادہؒ سے اس فقرہ کی تشریح ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

الّآ ان یکون لک ذو قرابة لیس علی دینک فتوصی له بالشیء هو ولیک فی النسب و لیس ولیک فی الدین

ہاں اس کی اجازت ہے کہ تمہارا کوئی قرابت دار ہو جس کا دین تمہارا دین نہ ہو اور تم اس کے لیے وصیت کرو۔ وہ رشتہ کے لحاظ سے تمہارا ولی ہے، دین کے لحاظ سے ولی نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے۔[3]

محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس سلسلے میں نازل ہوئی ہے کہ مسلمان یہودی اور نصرانی کو وصیت کرسکتا ہے۔[4]

صلۂ رحمی میں وقت ضرورت قرض دینا اور قرابت دار مجبور ہو تو قرض معاف کر دینا بھی شامل ہے۔

عبداللہ بن مروان نے حضرت مجاہدؒ سے پوچھا کہ میرا ایک مشرک رشتہ دار میرا مقروض ہے۔ کیا یہ قرض میں چھوڑ دوں؟ انھوں نے کہا: ہاں چھوڑ دو اور اس کے ساتھ

---

[1] عبدالرزاق، المصنف: ۶/ ۳۳ [2] حوالہ سابق: ۶/ ۳۳، ۳۴

[3] حوالہ سابق: ۶/ ۳۳، ۳۴

[4] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۴/ ۱۲۶

صلۂ رحمی کرو[۱]

اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا ایک ذریعہ تحفے تحائف دینا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو ایک ریشمی جوڑا بطور تحفہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ریشم کے استعمال سے تو آپ نے (مردوں کو) منع فرمایا ہے، پھر یہ مجھے کس لیے عطا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے پہنو، بلکہ اس لیے ہے کہ کسی اور کام میں لاؤ، کوئی دوسرا فائدہ اٹھاؤ۔ حضرت عمرؓ نے یہ جوڑا اپنے ایک (اخیافی) بھائی کو جو مشرک تھے، تحفہ میں بھیج دیا[۲]

اس حدیث کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

و فی هذا کله دلیل لجواز صلة الاقارب الکفار والاحسان الیهم و جواز الهدیة الی الکفار[۳]

اس سب میں دلیل ہے اس بات کی کہ کافر قرابت داروں کی صلہ رحمی اور ان کے ساتھ حسن سلوک جائز ہے۔ اس میں کفار کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کا جواز بھی موجود ہے۔

امام ابن قیمؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ غیر مسلم رشتہ دار نادار ہو تو کیا اس کا نفقہ خوش حال مسلمان پر واجب ہے؟ اس میں اور وراثت میں کیا فرق ہے؟ وہ فرماتے ہیں: اختلاف دین کے باوجود قرابت داروں پر انفاق کے واجب ہونے کی دلیل قرآن کی آیت ہے، جس میں مشرک والدین کے بارے میں کہا گیا 'وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا' (ان کے ساتھ دنیا میں معروف کا معاملہ کرو) یہ نہ تو احسان ہے اور نہ معروف ہے کہ ماں باپ اور رشتہ دار انتہائی ضرورت مند اور فاقہ زدہ ہوں اور اولاد

---

۱ ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳

۲ بخاری، کتاب الهبة، باب الهدیة للمشرکین۔ مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم استعمال، آنیة الذهب و الفضة الخ

۳ نووی، شرح مسلم: ج ۵، جز ۱۴، ص ۳۹

خوش حال ہونے کے باوجود ان کو کس مپرسی کے حال میں چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ نے صلۂ رحم کا حکم دیا ہے اور قطع رحم کی مذمت کی ہے۔ حدیث میں ہے: لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَاطِعُ رَحِمٍ [مسلم] (قطع رحم کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔ یہ صلۂ رحمی کے خلاف ہے کہ ایک مسلمان صاحب حیثیت ہونے کے باوجود ان غیر مسلم رشتہ داروں پر انفاق نہ کرے جو بھوکے پیاسے اور لباس کے محتاج ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

و صلة الرحم واجبة و ان كانت كافرة فله دينه و للواصل دينه[1]

صلہ رحمی واجب ہے، جس سے رحمی تعلق ہے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس کا دین اور صلہ رحمی کرنے والے کا اپنا دین۔

بعض لوگوں نے انفاق کو وراثت پر قیاس کیا ہے کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے، اسی طرح ان کا نفقہ بھی لازم نہیں ہونا چاہیے۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ میراث کی بنیاد نصرت وحمایت اور موالات پر ہے۔ اس کے برخلاف نفقہ کا تعلق صلہ رحمی اور قرابت کے حقوق سے ہے۔ عدم ایمان کی وجہ سے قرابت دار کے دنیوی حقوق ساقط نہیں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُم (النساء:۳۶)

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرو اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت والے ہم سایہ، اجنبی ہم سایہ اور ساتھ بیٹھنے والے ہم سایہ اور مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

اس آیت میں جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے ان کا حق واجب ہے، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے قرابت داروں کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] احکام اہل الذمہ، جلد ۲، ص ۷۹۱-۷۹۳

'احسان' کا سب سے نمایاں پہلو ضرورت پر انفاق ہے۔

غیر مسلم والدین اور قرابت داروں سے خونی رشتہ بہرحال ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کے احترام کی تعلیم دی ہے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنے، ان سے خوش گوار تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اگر وہ دین سے پھیرنے کی کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور اس سے بغاوت کی راہ پر لے جانا چاہیں تو ان کی اطاعت کسی قیمت پر نہیں کی جائے گی اور دین کی سربلندی کی راہ میں مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ بھی کیا جائے گا، لیکن ان کے دنیوی حقوق ادا کیے جاتے رہیں گے، ان میں کوتاہی نہ ہوگی۔

☆☆